نفاذِ شریعت میں تدریج

از جناب ابوالفتح محمد صغیرالدین
(صدر شعبہ تقابلِ ادیان و ثقافت اسلامی جامعہ سندھ)

اس بات پر اُمت کا اجماع ہے کہ پورا قرآن بتدریج حسبِ ضرورت کم وبیش ۲۳ سال تک نازل ہوتا رہا۔ تدریجاً قرآن کے نازل ہونے کی حکمت خود قرآن پاک میں اس طرح مذکور ہے۔

وقال الذین کفروا لولا نزل علیہ القرآن جملۃ واحدۃ کذٰلک لنثبت بہ فوادک ورتلناہ ترتیلا ۝ (الفرقان۔ ۳۲)

(کافر لوگ یوں کہتے ہیں کہ یہ قرآن آپ پر دفعتہً کیوں نازل نہیں کیا گیا۔ اس طرح اس لیے ہے تاکہ ہم اس کے ذریعے سے آپ کے دل کو قوی رکھیں اور ہم نے اس کو بہت ٹھیر ٹھیرا کر اُتارا ہے)۔

ایک دوسری آیت میں ہے:

وقرانا فرقناہ لتقرأہ علی الناس علی مکث ونزلناہ تنزیلا

(الاسراء۔ ۱۰۶)

(اور قرآن میں ہم نے جا بجا فصل رکھا تاکہ آپ اس کو لوگوں کے سامنے ٹھیر ٹھیر کر پڑھیں اور ہم نے اس کو اُتارنے میں بھی تدریجاً اُتارا)

اِن آیات سے معلوم ہوا کہ تدریجاً قرآن کے نازل کرنے کی غرض ایک تو یہ تھی کہ آپ اس کو لوگوں

کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں۔ دوسرے یہ کہ آپ کے دل کو قوی رکھنا مقصود تھا۔ کیونکہ اگر پوری کتاب ایک بار نازل کر دی جاتی تو نامہ و پیام کا سلسلہ منقطع ہو جاتا۔ پہلی وحی نے جس طرح آپؐ کے آتشِ شوق کو بھڑکا دیا تھا، اس کے پیش نظر مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ یہ سلسلہ جاری رہے اور اس میں انقطاع نہ ہونے دیا جائے۔ ہر حادثے اور ضرورت کے وقت جدید پیام کے آنے کی صورت ہیں اور اس طرح پیام کا سلسلہ جاری رہنے میں آپ کو جو سرور حاصل ہوتا ہو گا وہ تو احاطۂ بیان سے باہر ہے اور ظاہر ہے کہ سرور تقویت قلب کا باعث ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ غور کیا جائے تو اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس طریقے سے یہ کتاب تحریف وحذف و زیادتی سے محفوظ ہو گئی، کیونکہ اگر پوری کتاب ایک مرتبہ نازل ہو جاتی تو اس کو کثیر التعداد گروہ میں پھیلانا اور اس حد تک مشہور کر دینا کہ تواتر کی حد تک پہنچ جائے، ناممکن تھا۔ لیکن جب چند آیتیں نازل ہوتیں تو بہت آسان تھا کہ اس مختصر سے کلام کو تواتر کی حد تک پہنچا دیا جائے اور تمام لوگ اس کو یاد کر لیں۔ توریت کے نزول کو پیش نظر رکھا جائے تو تدریج کی حکمت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ پورے کا پورا ایک ہی دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کیا گیا تو ان کی قوم پر اس کا قبول کرنا مشکل اور بار ہو گیا اور ماننے سے انکار ہی کر دیا، جب پہاڑ ان پر لٹکا دیا گیا تب جا کر انھوں نے اس کو قبول کیا۔ اگر ایک ہی بار بہت سے اوامر و نواہی اور فرائض و واجبات بتا دیے جائیں تو آدمی تشویش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور ان پر عمل مشکل ہوتا ہے، بخلاف اس کے کہ ایک ایک دو دو احکام دیے جائیں تو آسانی اور خوشدلی سے ان پر عملدرآمد کرنے لگتا ہے۔

سیوطی نے اتقان (جلد اوّل صفحہ ۴۲) میں بحوالہ امام بخاریؒ حضرت عائشہؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

انما نزل اول ما نزل منه سورة من المفصل فيها ذكر الجنة والنار، حتى اذا ثاب الناس الى الاسلام، نزل الحلال والحرام، ولو نزل اول شئ لا تشربوا الخمر لقالوا لا ندع الخمر ابدا، ولو نزل لا تزنوا لقالوا لا ندع الزنا ابدا۔

(یعنی پہلے مفصل کی وہ آیتیں نازل ہوئیں جن میں جنّت اور دوزخ کا ذکر تھا۔ یہاں

تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہو گئے اور اس پر جم گئے تو حلال و حرام کی آیتیں نازل ہوئیں۔ اگر پہلے ہی یہ کہا جاتا کہ شراب نہ پیو تو یہ لوگ کہتے کہ ہم کبھی شراب نہ چھوڑیں گے اور اگر ان سے کہا جاتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی زنا نہ چھوڑیں گے)۔

اللہ تعالیٰ جو انسانی فطرت سے سب سے زیادہ واقف ہے اور حکیم و رحیم بھی ہے۔ اس کی حکمت و رحمت کا تقاضا یہی تھا کہ احکام اپنے بندوں پر اس طرح نازل کرے کہ ان کا حفظ و ضبط آسان ہو اور اُن پر عمل کرنا ایسا دشوار نہ ہو جائے کہ گھبرا کر انکار ہی کر بیٹھیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہجرت سے قبل قرآن کا جس قدر حصہ نازل ہوا اس میں ان تین بنیادی باتوں کا ذکر ہے۔

۱۔ توحید ۲۔ رسالت ۳۔ آخرت۔

۱۔ توحید سب سے پہلا بنیادی عقیدہ ہے جو ان کے دلوں میں راسخ کیا گیا۔ یعنی یہ کہ اللہ ہی لائق عبادت ہے، وہی نفع و ضرر کا مالک ہے، اس کے سوا کوئی ذات ایسی نہیں جس سے نفع کی اُمید کی جائے یا کسی کے ضرر سے خوف کھایا جائے، وہی تمام چیزوں کا خالق و مالک ہے۔ اس کے احاطہ علم و قدرت سے کوئی شے باہر نہیں، وہ ہمارے تمام احوال و اعمال سے باخبر ہے۔

۲۔ رسالت کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے ہر زمانہ اور ہر قوم میں رسولوں کو بھیجتا رہا ہے تاکہ لوگ ان کی تعلیمات کے مطابق عمل کر کے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کریں اور اُن کو اپنے عمل کے لیے نمونہ بنائیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس سلسلہ کی آخری کڑی ہیں کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ چنانچہ ساری دُنیا میں قیامت تک آپ ہی کے طریقہ پر عمل ہوتا رہے گا۔ اور اسی طریقہ کو اللہ تعالیٰ کی رضا اور پسندیدگی حاصل ہے۔

۳۔ آخرت سے مراد یہ ہے کہ انسان کی زندگی اسی دُنیا تک محدود نہیں کہ مرنے کے بعد ہڈیاں بوسیدہ ہو گئیں اور بس معاملہ ختم ہو گیا، بلکہ ایک وقت ایسا آنے والا ہے کہ جب تمام لوگ دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور اللہ کے پاس لوٹائے جائیں۔ اور اس دُنیا میں جو کچھ کیا ہے اُس کا حساب ہر شخص کو دینا ہو گا۔ اگر نیک عمل کیا ہے تو اُس کا اجر ملے گا اور بُرائی کی ہے تو اُس پر سزا ملے گی، اور وہاں کا اجر یا سزا ابدی ہے۔ مختصر یہ کہ اپنے تمام اعمال کی جواب دہی کرنی ہو گی۔ کوئی چھوٹا یا بڑا عمل اللہ کی نگاہ سے مخفی نہیں کہ وہ حساب سے رہ جائے۔

تیرہ سال تک اِن عقائد کی تعلیم دی گئی اور اُن کے ذہنوں میں ان کو بالکل راسخ کر دیا گیا — ایک ایسے خدا پر اُن کا یقین محکم کیا گیا جو ہر شخص کے اعمال و احوال بلکہ دل میں پیدا ہونے والے خیالات اور وسوسوں سے بھی واقف اور باخبر ہے۔ چنانچہ ایمان لانے والے خدائے واحد کے پرستار بن گئے اور عملی دُنیا میں صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنے پر راضی ہو گئے۔ پھر آخرت کی جوابدہی کا احساس اس قدر قوی ہوگیا کہ اگر کسی سے بشری کمزوری کی بنا پر کسی گناہ کا ارتکاب ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے گناہ کا اعتراف کر کے خود اپنی ذات پر شرع کی مقرر کردہ سزا کو نافذ کرایا، کیونکہ انہیں اس کا یقین تھا کہ آخرت کی سزا بہت ہی تکلیف دہ ہوگی، اس خوف سے دُنیا ہی میں اس کی سزا قبول کرنا تاکہ آخرت کی سزا سے محفوظ رہیں۔ پھر اس اعتراف جرم پر انہیں یہ سند ملی کہ یہ ایسی توبہ ہے کہ تمام اہل مدینہ کو اپنی وسعت میں ڈھانپ لے۔

اس قسم کی اخلاقی بلندی اُن حضرات کو اِن ہی عقائد کی بنا پر حاصل ہوئی تھی جن پر ۱۳ سال تک اُن کو پختہ کیا گیا تھا۔ پھر یہ حال ہوا کہ کسی حکم کے نازل ہونے پر اپنے دل میں چون وچرا کی گنجائش نہیں پاتے تھے بلکہ کوئی حکم نازل ہوتا تو فوراً بلا پس و پیش اس پر عمل شروع کر دیتے۔ حکم کو نافذ کرنے کے لیے کسی جبر کی ضرورت نہ تھی۔ شراب کی حرمت اس کی بیّن مثال ہے کہ پہلے تو اس کی خرابی ذہن نشین کرائی گئی۔ پھر نشہ کی حالت میں نماز سے منع فرمایا گیا۔ اس کے بعد جا کر اُس کی حرمت کا اعلان کیا گیا اور جب اعلان ہوا تو سبوں نے شراب کے مٹکے انڈیل دیئے اور شراب گلیوں میں بہنے لگی۔

گویا یہی ترتیب فطری ہے کہ پہلے عقائد محکم ہوں۔ لوگوں کے ذہن تبدیل کیے جائیں۔ پھر احکام دیئے جائیں۔ اسی لئے ہجرت سے قبل جس قدر آیات نازل ہوئیں وہ عقائد سے تعلق رکھتی ہیں اور احکام کے متعلق جس قدر آیتیں نازل ہوئیں وہ مدینہ میں نازل ہوئیں۔ فرائض و احکام اور عبادات میں اسی ترتیب و تدریج کا اصول کارفرما رہا۔ ایسا نہیں ہوا کہ کسی عبادت کے متعلق تمام احکام یکبارگی نازل کر دیے گئے ہوں۔ بلکہ ہر حکم کو آہستہ آہستہ نافذ کیا گیا۔

اگرچہ احکام و عبادات کی تاریخ کا بیان مقصود نہیں لیکن مثال کے طور پر چند احکام و عبادات کا اجمالاً ذکر کیا جاتا ہے کہ کس طرح ایک ایک حکم اور عبادات میں تدریجی عمل کا ظہور رہا۔

نماز — چونکہ تین سال تک دعوت پوشیدہ طور پر دی جاتی رہی نیز کفار کے ڈر سے دن کو علانیہ نماز

پڑھنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے پہلے تو صرف رات کو دیر تک نماز پڑھتے رہنے کا حکم تھا۔ دن میں کوئی نماز فرض نہ ہوئی۔ رات کو اس طویل نماز کا نام تہجد تھا۔ پھر صبح و شام کی دو رکعتیں فرض ہوئیں۔ شب معراج میں پانچ وقت کی نمازیں فرض ہوئیں لیکن رکعتیں دو ہی رہیں۔ جب مدینہ منورہ میں اطمینان کی صورت نصیب ہوئی تو رکعات کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ قبلہ بدل گیا۔ نماز میں خشوع و خضوع اور اُس کے آداب و ارکان جواب تک لازمی نہیں تھے، رفتہ رفتہ اُن کی بھی تکمیل کی گئی۔ نماز میں آسمان کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی ممانعت کر دی گئی۔ اور نماز کے دوران باتیں کرنے سے روک دیا گیا۔ سلام کرنا یا اُس کا جواب دینا ممنوع ہو گیا۔ مہاجرین حبشہ جب مدینہ پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت نماز میں مشغول تھے۔ معمول کے مطابق اُن لوگوں نے سلام کیا۔ لیکن آپؐ نے اُس وقت جواب نہیں دیا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ اب خدا نے حکم دیا ہے کہ نماز میں باتیں نہ کرو۔ تشہد کے الفاظ سکھائے گئے، طہارت کے طریقے سکھائے گئے، اوقات کی تعیین کی گئی، اذان کی تعلیم دی گئی، اِس طرح رفتہ رفتہ نماز کی ہیئت، خشوع و خضوع اور اس کے لوازمات وجود میں آئے جن پر مسلمان آج عمل پیرا ہیں۔

روزہ اسلام سے پہلے قریش عاشورہ کے روزے رکھتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کا روزہ رکھتے تھے اور غالباً صحابہ بھی آپ کی پیروی میں یہ روزہ رکھتے ہوں گے۔ حضرت جعفرؓ نے نجاشی کے دربار میں جو تقریر کی تھی اُس میں روزہ کا بھی ذکر ہے۔ پھر جب آپؐ مدینہ تشریف لائے تو دیکھا کہ یہود بھی اُس دن کا روزہ رکھتے ہیں۔ آپ نے اس کی وجہ دریافت فرمائی تو لوگوں نے بتایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی دن فرعون کے ہاتھ سے نجات پائی۔ آپؐ نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کی تقلید کا تو ہم کو زیادہ حق ہے۔ چنانچہ یہاں بھی آپؐ نے عاشورہ کا روزہ رکھا۔ پھر ۲ھ میں رمضان کے روزے فرض ہوئے تو عاشورہ کا روزہ مستحب ہو گیا۔ یعنی جس کا جی چاہتا تھا یہ روزہ رکھتا تھا اور جو نہیں چاہتا تھا نہیں رکھتا تھا۔ لیکن آپؐ نے اُس دن کا روزہ برابر رکھا۔ یہود اس طرح روزہ رکھتے تھے کہ نمازِ عشاء کے بعد پھر نہیں کھاتے تھے اور اس کو حرام سمجھتے تھے۔ ہم بستری بھی ممنوع تھی۔ چنانچہ ابتدا میں مسلمان بھی اس طریقے کے موافق مامور تھے۔ لیکن بعد میں صبح صادق تک کھانے پینے اور تمام اشغال کی اجازت دے دی گئی اور سحری کھانے کی فضیلت بیان کی گئی۔

اور یہ بھی بتایا گیا کہ سحری صبح کے قریب کھائی جائے۔ نیز یہ کہ جب روزے کی فرضیت نازل ہوئی تو پہلے یہ اختیار تھا کہ جو شخص چاہے روزہ رکھے اور جو چاہے روزہ کے بدلے ایک غریب کو کھانا کھلا دے۔ رفتہ رفتہ جب لوگ روزہ کے خوگر ہو گئے تو فدیہ کی اجازت جاتی رہی۔ البتہ جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو اس کے لیے یہ حکم ہوا کہ اس وقت چھوڑ دے اور ان کے بدلے کسی اور وقت قضا کرے۔

زکوٰۃ | اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی ترغیب تو ابتدائے اسلام سے ہی دی جاتی تھی، لیکن مدینہ منورہ میں کچھ زیادہ تاکید کی گئی۔ صدقۂ فطر ۲ھ میں عید کے دن واجب قرار دیا گیا۔ ہجرت کے بعد ابتدائی زمانہ میں مسلمانوں کی حالت بہت خراب تھی۔ اس لیے حکم ہوا کہ جو کچھ اپنی ضرورت سے بچ جائے، سب خیرات کر دیا جائے۔ چنانچہ صدقہ اور خیرات کا اس قدر شوق پیدا ہو گیا کہ جو لوگ نادار تھے وہ بھی شوق رکھتے تھے کہ مزدوری ملے تو خیرات دی جائے۔ لیکن زکوٰۃ فتح مکہ کے بعد ۸ھ میں فرض کی گئی اور اس کے مصارف بیان کیے گئے۔ ۹ھ میں محصلین روانہ کیے گئے۔

حج | عرب میں حج کا سلسلہ تو پہلے ہی سے جاری تھا۔ لیکن چونکہ کفار نے اس میں بہت سی غلط رسمیں ایجاد کر رکھی تھیں، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں اصلاحات کیں۔ مثلاً ننگے ہو کر طواف کرنا، گھروں میں دروازوں سے داخل نہ ہونا، اور اس طرح کی دیگر رسموں کو موقوف کیا گیا۔ پھر آخر میں مشرکین کو حج کی ممانعت کر دی گئی اور ان کا داخلہ حرم میں ممنوع قرار دے دیا گیا۔

صدیوں تک باطل نظام ہائے زندگی کے تحت زندگی گزارنے کی وجہ سے ہماری عادتیں بگڑ کر پختہ ہو چکی ہیں۔ اس لیے جاہلیت جدیدہ کا یہ دور بھی جاہلیتِ قدیمہ کے دور سے اس لحاظ سے مختلف نہیں کہ غیر مسلم کا تو کہنا ہی کیا، مسلم بھی اسلامی نظام کی افادیت اور اس کے قابلِ عمل ہونے کی جانب سے تذبذب اور بے یقینی کا شکار ہیں۔ اس لیے پہلے بے یقینی کی جگہ یقین پیدا کرنا ہوگا، اور احکام کے نافذ کرنے میں کچھ ترجیحات اختیار کرنی ہوں گی اور سوچنا پڑے گا کہ کس حکم کو پہلے نافذ کرنا ہے اور کس کو بعد میں؟ کیونکہ یہی فطری طریقہ کار ہے۔

اس سلسلہ میں پہلے تو مساجد کے نظام کو مستحکم اور از سر نو مربوط کر کے ان کے ائمہ سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ یہ نظم موجود ہے لیکن شکستہ حال ہے۔ اس کو فعال بنایا جا سکتا ہے۔ مسجدوں کے متعلق ایک عام تاثر یہ ہے کہ وہاں صرف نماز پڑھنے کے لیے جانا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ نمازی ہیں وہی مسجد میں جاتے ہیں اور باقی لوگوں کا مسجدوں سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ کوئی رشتہ دار مر گیا تو مسجد میں جا کر قرآن خوانی کرا لی یا میت کو مسجد کے پاس لے جا کر اس کی نماز جنازہ پڑھوا لی یا ثواب کی غرض سے مسجدوں میں چراغاں کا اہتمام اپنے خرچ سے کرا دیا۔ مساجد کو تمام لوگوں کے لیے پُرکشش بنانے کی ضرورت ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ دنیاوی ضرورتیں بھی مساجد سے وابستہ کر دی جائیں تو لوگ لامحالہ مسجدوں میں جانے اور ان سے تعلق رکھنے پر مجبور رہیں گے۔ نماز یا عبادات کا فوری فائدہ محسوس نہیں ہوتا، اس لیے بہت کم لوگ مساجد کا رخ کرتے ہیں۔ اگر دنیوی ضرورتیں بھی وہاں سے پوری ہونے لگیں تو لوگ مجبوراً مساجد کی طرف جائیں گے۔ وہاں نماز بھی ادا کریں گے اور نماز پڑھنے کے جو فوائد اخلاقی معاشرتی ہیں وہ حاصل ہوں گے۔ ان کا یہ یقین آہستہ آہستہ پختہ ہوتا جائے گا کہ مسجد میں جانے سے صرف آخرت ہی نہیں بلکہ دنیا بھی ملتی ہے اس طرح دین و دنیا کا فرق ان کے ذہن سے دور ہوتا جائے گا اور شرعی احکام کا بجا لانا ان کے لیے آسان ہوتا جائے گا۔ ابتداءً تجربہ کے طور پر یہ چیزیں کرنے کی ہیں۔

۱۔ زکوٰۃ و صدقات کی تقسیم مساجد کے ذریعے کرائی جائے۔

۲۔ ہر مسجد کے ساتھ ایک حلقہ آبادی کا مخصوص کر دیا جائے کہ وہاں رہنے والوں کے گھروں کے احوال و کوائف کا ریکارڈ ائمہ مساجد کے پاس ہو۔

۳۔ راشن کے کام کی نگرانی، راشن کارڈ اور شناختی کارڈ کے حصول اور اس طرح کے دیگر سرٹیفکیٹ کے اجراء کا حق ائمہ مساجد کو دیا جائے۔

۴۔ محلہ کے جھگڑوں کے تصفیہ میں ائمہ مساجد کا اثر پیدا کیا جائے۔

۵۔ ائمہ مساجد پہلے تو لوگوں کو وعظ و تبلیغ کے ذریعے، پھر زجر و توبیخ کے ذریعے اہل محلہ کو مسجد میں آنے پر مجبور کریں۔ مہینہ میں ایک یا دو بار اہل محلہ کے مسائل اور ان کے حل کے لیے مشاورت

کے طور پر نماز کے اوقات میں میٹنگ طلب کریں تاکہ لوگ نماز میں شریک ہونے کے بعد اپنے مسائل پیش کریں اور اُن کے حل کی تدابیر پر غور کریں۔

۶۔ ایسے ائمہ کا تقرر کیا جائے جو باوقار اور باصلاحیت ہوں، جھگڑالو یا متعصب نہ ہوں، فرقہ وارانہ بحثوں میں نہ اُلجھیں، اور اکثریت اُن کے طرزِ عمل سے مطمئن ہو۔

غرض اس طرح کی بہت سی ایسی صورتیں ہیں جن کے ذریعے مساجد کو مؤثر کشش بنا کر لوگوں کے ذہنوں میں تبدیلی پیدا کی جاسکتی ہے۔